شدت پسندی کے خلاف مزاحمت کی ایک بلیغ علامت: رشید جہاں

ڈاکٹر شاہد اقبال کامران*

ڈاکٹر نورینہ تحریم بابر**

Abstract:

Dr. Rasheed Jahan is one of the most prominent progressive literary figures of the 1st half of 20th century. She is a short story writer and especially popular for her stories published in "Angaray" in 1932. She challenged the authority of mulla and feudal of her society and resisted before their so called standards of life. She also played an active role in the communist party of India as was very close to Sajjad Zaheer and Faiz Ahmad Faiz. It was Rasheed Jahan who forced Faiz Sahib to leave romanticism and choose socio-political context of his time for the poetic expression. This article discusses the life and works of Rasheed Jahan as a vital and charismatic symbol of resistance to the extremism

برصغیر میں بیسویں صدی کے اوائل اور نصف اول کا زمانہ اپنے مزاج کے اعتبار سے بڑا تند، بے حد تیز، بلند آہنگ، پُرشور، سرکش، بے باک، شوریدہ اور ہر طرح کے تغیر کے لیے بے چین زمانہ تھا۔ عالمگیر سیاست ایک نئے اور متحارب نظمِ عالم کی طرف رواں تھی۔ برصغیر کے ہمسائے میں برپا ہونے والے اشتراکی انقلاب نے قسمت نامہ مزدور و سرمایہ دار کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ پرانی سیاست گری خوار تھی اور یقینی طور پر زمین میر و سلطاں سے بے زار ہو رہی تھی۔ زندہ ہونے کا سب سے حساس پہلو یعنی ادبی ابلاغ بھی ہمہ نوع انقلاب کی زد میں تھا۔ قلم وہی تھا، زبان وہی تھی لیکن بیان اور اسلوب و آہنگ بدل رہا تھا۔ کچھ یہی دور ہے کہ اردو میں روسی اور فرانسیسی ادب کے تراجم سامنے آنا شروع ہوئے اور انھوں نے اردو بیانیے پر شدت سے اثر انداز ہونا شروع کیا۔ بات کہنے، کرنے اور سمجھانے کے نت نئے ڈھنگ اور جدا اسلوب سامنے آنے لگے۔ واقعات کو الگ انداز سے دیکھنے، بیان کرنے اور

* صدر شعبہ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔

** شعبہ اُردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔

تجزیہ کرنے کی روش بدلنے لگی۔(۱)

تاریخ وسیاست کے طالب علم کو ۱۹۳۲ء کا سال آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں اقبال کے خطاب کے حوالے سے اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے جس میں اقبال اقوام ایشیاء کو ایک ایسے معاشرے کے قیام کی طرف متوجہ کر رہے ہیں ''جہاں انسانی معاشرہ شکم کی مساوات پر نہیں، روحوں کی مساوات پر قائم ہو۔ جہاں ایک اچھوت بادشاہ کی لڑکی کو عقد میں لاسکتا ہو، جہاں ذاتی ملکیت ایک امانت ہو۔ جہاں اس طور پر ارتکاز دولت کا امکان نہ ہو کہ وہ دولت پیدا کرنے والے پر ہی چھا جائے، لیکن تمہارے عقیدہ کا یہ معراج نشاۃ وسطی کے فقہوں کی نازک خیالیوں سے پاک ہونا چاہیے۔ روحانی طور پر ہم ان تخیلات اور احساسات کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں جو ہم نے پچھلی صدیوں کے دوران میں اپنے گرد لپیٹ لی ہیں اور یہ ہم بڑوں کے لیے بھی باعث شرم ہے کہ ہم نے نئی پود کو ان اقتصادی، سیاسی اور مذہبی انقلابات کے لیے تیار نہیں کیا جو موجودہ دور میں انھیں پیش آئیں گے۔''(۲) ۱۹۳۲ء کا یہی سال اقبالیات کے طالب علم کے لیے ''جاوید نامہ'' کے حوالے سے قابل توجہ ہے جس کے اختتام میں اقبال خدا کی زبان سے کہلواتے ہیں کہ (اے انسان) اپنے اندر قوت تخلیق پیدا کرو، تم میں سے جو خالق نہیں ہمارے نزدیک وہی سب سے بڑا کافر و زندیق ہے۔(۳) اور یہی ۱۹۳۲ء کا سال اردو زبان وادب کے طالب علم کے لیے ماہ دسمبر میں لکھنؤ سے شائع ہونے والے دس کہانیوں کے مجموعے ''انگارے'' کی اشاعت کے حوالے سے اہمیت رکھتا ہے۔ افسانوں کا یہ مجموعہ انسانوں نے انسانوں کے لیے مرتب کیا تھا، لیکن انگارے کو حیوانوں جیسے ردعمل کا سامنا کرنا پڑا۔ انگارے پر سب سے دلربا الزام فحاشی کا لگا، تفصیل تو معلوم نہیں لیکن فحاشی سے مراد شاید وہ تمام اعمال ہوتے ہیں جن کے مرتکب اگر ہم خود ہوں اور کسی کو پتہ بھی نہ چلے تو درست اور اگر وہی سب کچھ کوئی اور کر گزرے اور ہمیں نزدیک بھی نہ آنے دے تو گناہ کبیرہ۔ کچھ اسی خام تاثر کی بنا پر اردو پڑھنے والے عام طالب علموں کے لیے میر اثر کی مثنوی خواب وخیال اور نظیر اکبر آبادی کے حذف شدہ الفاظ سے پاک کلیات کی طرح افسانوں کا یہ مجموعہ بھی نادر و نایاب ہی رہا۔ ''انگارے'' کی اشاعت نے جو بھی قیامت مچائی۔ اس کی دیگر متعدد وجوہ میں سے ایک قابل ذکر وجہ ایک خاتون کا افسانہ نگاروں میں شامل ہونا تھا۔ اگر یہ کرہ ارض واقعی مردوں کی ملکیت ہے تو پھر ایک خاتون کی طرف سے یہ جرأت قابل معافی خیال نہیں کی جاسکتی۔ یہ خاتون رشید جہاں تھیں۔ میڈیکل ڈاکٹر رشید جہاں جنھیں تحقیر سے ''رشید جہاں انگارے والی'' بھی کہا جاتا رہا۔ ہمارے لیے رشید جہاں اس لیے اہم اور قابل توجہ ہیں کہ بیسویں صدی کے نصف اول میں مذہب کے نام پر معاشرے کو دہشت زدہ کرنے والے خوفزدہ ملّاؤں اور ان کے ہمنواؤں کے سامنے وہ نہایت استقامت سے کھڑی رہیں۔ رشید جہاں کی یہی ثابت قدمی انھیں

اکیسویں صدی کے لیے ایک عمدہ اور قابل تقلید نمونے کے طور پر پیش کرتی ہے۔ رشید جہاں کی نفرت کو تحلیل کر دینے والی ملکوتی مسکراہٹ نے فتووں کی بوچھاڑ کرنے والے مفتیان کرام اور سنگسار کرنے کے مطالبات کرنے والے علمائے عظام کو بے بس کر کے رکھ دیا۔ وہ دور انگریزی حکومت کا تھا۔ ملّا منہ سے آگے نکالنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ ذرا تصور کیجیے ڈاکٹر رشید جہاں یہی جسارت اسلامیہ جمہوریہ پاکستان میں کرتی تو ملّا کا ردعمل اور عمل کیا ہوتا؟

امر واقعہ یہ ہے کہ افسانوں کے اس مجموعے پر پابندی نہ تو مبینہ طور پر اخلاق باختہ ہونے پر لگی اور نہ ہی کسی ناقابل برداشت ادبی نصب العین کو روکنے کے لیے، پابندی کی واحد وجہ سیاسی ملاؤں کو ان کی طاقت اور صلاحیت کی طرف متوجہ کرنا تھا۔ وہی ملّا جس کو منبر و محراب سے نکال کر تحریک خلافت کے نام پر پہلے تو احتجاجی سیاست کی رسمیات سے آشنا کیا گیا، پھر غل مچانے اور شر پھیلانے کے طور طریقے کرم چند موہن داس گاندھی کی قیادت میں سکھائے گئے اور پھر ایک خطرناک ہتھیار کی صورت جدید تعلیم حاصل کر کے زندگی کے احوال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار متوسط طبقے کے مسلمانوں کے درمیان چھوڑ دیا گیا۔ اس قضیئے کی جزییات کا ادراک ''انگارے'' کے جملہ مصنفین کو بھی تھا۔ ۱۵/اپریل ۱۹۳۳ء کے وضاحتی بیان میں مصنفین نے برملا صراحت کی تھی کہ ''.....وہ عمومی طور پر بنی نوع انسان اور خصوصی طور پر ہندوستانی عوام کے لیے اہم ترین امور کے سلسلے میں آزادی تنقید اور آزادی اظہار کے حق کی حمایت کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں مصنفین نے اسلام کا انتخاب اس لیے نہیں کیا کہ انھیں اسلام سے کوئی خصوصی پرخاش ہے بلکہ اس لیے کہ وہ خود ی اسلامی معاشرے میں پیدا ہوئے ہیں اور اپنے آپ کو اس معاشرے کے بارے میں گفتگو کرنے کا زیادہ اہل سمجھتے ہیں۔''(۴) متوسط طبقے کے جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کا اپنے معاشرے اور اپنی اقدار پر گفتگو کرنے کا خود کو اہل سمجھنے کا حق اس پورے قضیئے کا اساسی نقطہ ہے۔ یہ حق آج بھی وجہ نزاع بنا ہوا ہے اور اس نزاع کے مظاہر اطراف و جوانب ملاحظہ و مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں۔

انگارے پر شدید ردعمل ظاہر کرنے والے بخوبی جانتے تھے کہ ان ''انگاروں'' کا رخ کس طرف ہے۔ برصغیر میں دراصل ''انگارے'' مذہبی شدت پسندی، بے جا تفوق اور اجارہ داری کے خلاف پہلا مربوط، مضبوط اور برملا ادبی ردعمل تھا۔ سمجھنے والے سمجھ گئے اور اس کے خلاف ڈٹ گئے۔ عام لوگوں کو متوجہ اور مخالف کرنے کے لیے الزام اس مجموعے پر فحاشی کا لگایا گیا۔ جن لوگوں نے اسے نہیں بھی پڑھا تھا ان کے کان بھی سرخ اور آنکھیں انگارہ ہو گئیں یوں ایک سیدھے سادے ادبی اور سماجی کہ: ادیب بھی اپنے معاشرے یعنی مسلمان معاشرے کے بارے میں گفتگو کرنے کا زیادہ اہل سمجھتے ہیں، کو ایک اخلاقی اور ساتھ ہی چپکے سے مذہبی مسئلہ بنا لیا گیا۔ یہ آزادی اظہار اور آزادی تنقید کا مسئلہ تھا۔ اسلامی معاشرے میں پیدا ہونے والے پڑھے لکھے لوگ اپنی ذہنی اور معاشرتی زندگی پر

رائے دینے اور تبصرہ کرنے کا حق مانگ رہے تھے۔اس طرح کا حق طلب کرنا یقینی طور پر فحاشی کی ذیل میں نہیں آتا۔

مذہب کو آڑ بنا کر کی جانے والی دہشت گردی کے سامنے سب سے مؤثر اور بامعنی کردار ادا کرنے والی جوان ہمت دانشور رشید جہاں کی عمر بھر کی مساعی ہماری سماجی اور ادبی زندگی کا ایک نہایت روشن باب ہے۔ڈاکٹر رشید جہاں سے قریب قریب ۳۰ افسانے، ۹ ڈرامے اور ۶ مضامین یادگار ہیں۔(۵) خود انگارے میں ان کی دو تحریریں شامل تھیں اور ان دونوں پر کسی طور پر فحش ہونے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ہاں مگر، کسی معاشرے میں عورت ہونا ہی بجائے خود فحاشی کی ذیل میں آجائے تو کوئی کیا کہے۔دراصل زندگی کو تذکیر و تانیث کی تقسیم سے دیکھنے کی سعی اپنے اندر تضادات کا ایک جہاں آباد رکھتی ہے۔معاشرے کو ایک مرد کی آنکھ سے دیکھا جائے یا ایک عورت کی آنکھ سے؟ موزوں یہ معلوم ہوتا ہے کہ معاشرے کو محض ایک انسان کی آنکھ سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ رشید جہاں کے جملہ مفاخر کو محض یہ کہہ کر ٹھکانے نہیں لگایا جا سکتا کہ ''اردو افسانے میں پہلی مرتبہ ایک خاتون انشائے لطیف یا اصلاحی قصوں کے راستے سے نہیں بلکہ ہر طرح کے مردانہ موضوع پر افسانے لکھنے کی ہمت لے کر آئی تھی۔''(۶) یہاں مردانہ موضوع سے متعین طور پر کیا مراد ہے؟ یہ سراغ تو نہیں ملتا لیکن قیاس چاہتا ہے کہ غالباً وہ تمام موضوعات اور احوال جن پر اس دور کی خواتین قلم اٹھانے سے گریزاں ہوں۔رشید جہاں نے زندگی کے احوال وظروف کو ایک انسان کی نظر سے دیکھنے کی طرف متوجہ کیا۔جس ہمت اور جرات کو ان کی شناخت کا عنوان قرار دیا جاتا ہے وہ اپنی صنفی شناخت اور رجحان سے بلند ہو کر زندگی کو سمجھنے اور سمجھانے کی روش ہے جس پر انھوں نے خود بھی عمل کرنے کی کوشش کی اور اپنی عملی مساعی سے معاشرے میں دور رس تبدیلیاں لانے کے لیے ان تھک محنت بھی کی۔ رشید جہاں نے پرشور اور ہنگامہ خیز زندگی کے دامن میں سے صرف سنتالیس ۴۷ برس چرائے اور ان کے بدلے میں ہماری ادبی اور سماجی تاریخ کے دامن کو صدیوں کی ثروت خیز بصیرت سے بھر دیا۔ہماری ادبی تاریخ میں ۱۹۳۵ء میں تین اہم واقعات رونما ہوتے ہیں۔اوّل اقبال کا اردو مجموعہ کلام ''بال جبریل'' شائع ہوا۔جس میں عجیب مناظر نظر آ رہے ہیں۔لینن خدا کے حضور کھڑا سوالات پہ سوالات کیے جا رہا ہے۔خدا فرشتوں کو دنیا بھر کے غریبوں کو جگانے اور کاخ امراء کے در و دیوار ہلانے کا فرمان جاری کر رہا ہے۔دوم فیض احمد فیض کو امرتسر کے ایم اے او کالج میں انگریزی کے لیکچرار کی ملازمت ملی اور تیسرے یہ کہ وہاں ان کی ملاقات محمود الظفر اور ان کی بیگم رشید جہاں سے ہوئی۔ایوب مرزا فیض کی سوانح بہ عنوان ''فیض نامہ'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''یہ فیض کی عاشقی کا زمانہ تھا کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا تھا اور درد دل سے نجات پانے کا کوئی ہنر یا گُر سوجھتا نہیں تھا.....اسی اثناء میں محمود الظفر کی بیگم ڈاکٹر رشید جہاں وہاں

پہنچیں۔فیض سے ملاقات ہوئی انھوں نے فیض کی حالت زار ملاحظہ کی۔تفتیش کے بعد وہ اس کا مرض جان گئیں۔ باکمال رشید جہاں نے فیض کو سمجھایا چھوڑو یہ عاشقی کے چکر۔تم کس چکر میں پڑے ہو۔ یہ سب فضول بات ہے۔ دنیا کے جو دکھ ہیں ان کی نوعیت زیادہ سنگین ہے۔تمہارا یہ عاشقی کا چھوٹا سا معاملہ ہے۔''(۷)

ڈاکٹر رشید جہاں کے توسط سے فیض نے کمیونسٹ مینی فسٹو کا مطالعہ بھی کیا۔نوجوان فیض کے لیے رشید جہاں کی توجہ اور تربیت پر اصرار سے محفوظ رہنا تقریباً ناممکن ہی تھا۔ وہ اس کم گو، بظاہر شرمیلے نوجوان کی ذہانت کو بھانپ چکی تھیں۔اپنی معروف تالیف روشنائی میں سجاد ظہیر نے رشید جہاں اور فیض کے تعارف اور اولین دورہ لاہور کے احوال کی جو تفصیل بیان کی ہے اس سے جہاں ایک طرف رشید جہاں کی دوسروں کو اپنے فیصلہ کن خلوص اور اپنی دوٹوک راست روی سے متاثر کرنے کی طاقت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے، وہیں ان کے حیرت انگیز کردار کے کچھ دیگر پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔سجاد ظہیر لکھتے ہیں کہ:

''رشیدہ کو امیروں، بڑے آدمیوں، کام نہ کرنے والے غیر سنجیدہ خوش باشوں سے ایک عام نفرت تھی۔اپنی ڈاکٹری کے سلسلے میں ان کو اکثر ایک ایسے لوگوں کے گھروں میں جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور انھیں اس طبقے کا کچا چٹھا ان کے زنانہ مکانوں کے ذریعے سے معلوم تھا۔وہ ان امیروں کی کیفیت سے بھی واقف تھیں۔جنھوں نے اپنی مدقوق بیگموں کو گندے محل سراؤں میں مقفل کر کے باہر مردانے میں بھونڈے ڈرائینگ روم سجائے تھے..... انھوں نے اپنی زبان قومی انفرادیت اور تہذیب کی دولت گنوادی تھی۔ان کی ذہنی پراگندگی ان کے روحانی افلاس سے کم نہ تھی۔''(۸)

لاہور ہی میں رشید جہاں کا فیض کی وساطت سے صوفی تبسم سے تعارف ہوا۔ دونوں بظاہر بالکل مختلف مزاج کے لوگ تھے لیکن حیرت انگیز طور پر رشید جہاں کے فیصلہ کن خلوص اور دوٹوک راست روی نے صوفی تبسم کو جو فیض کے استاد بھی تھے متاثر کر لیا۔سجاد ظہیر یہ تفصیل بتاتے ہیں:

''رشید جہاں اور صوفی صاحب ملے تو اس کے باوجود کہ دونوں کے مزاجوں میں بڑا فرق تھا، دونوں کو ایک دوسرے سے حقیقی انس ہو گیا۔رشیدہ کے مزاج میں ایک قسم کی تندی تھی اور سچی بات چاہے کتنی کڑوی کیوں نہ ہو اگر ان کی سمجھ میں آجاتی تھی تو وہ کسی کا لحاظ کیے بغیر کہہ گزرتی تھیں۔اس کے برخلاف صوفی صاحب اس قدر مہذب واقع ہوئے ہیں کہ اگر انھیں ذرا بھی گمان ہو کہ ان کی بات سے کسی کا دل دکھے گا تو ضرورت پڑنے پر بھی بولنے سے گریز کر جائیں گے اور دل میں رکھیں گے پھر بھی ان

دونوں کی خوب بنتی تھی۔''(۹)

رشید جہاں نے اپنے خلوص اور مقصد کی سچائی اور اپنی نہایت زیرک شخصیت سے اختر شیرانی کے رنگ میں شاعری کرنے والے نوجوان شاعر کو ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم کی طرف متوجہ کرتے ہوئے صاف صاف بتا اور سمجھا دیا کہ راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا۔ فیض نے اس دوران جو کچھ سیکھا اور سمجھا وہ خود فیض کے الفاظ میں صرف یہی تھا کہ:

> ''حیات انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسب توفیق شرکت، زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔ فن اس زندگی کا ایک جزو اور فنی جدوجہد اسی جدوجہد کا ایک پہلو ہے۔ یہ تقاضا ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ اس لیے طالب فن کے مجاہدے کا کوئی نروان نہیں۔ اس کا فن دائمی کوشش ہے اور مستقل کاوش۔''(۱۰)

اگر فیض احمد فیض کو رشید جہاں کی تصانیف میں شمار کر لیا جائے تو کچھ ایسا غلط نہ ہوگا۔ رشید جہاں کے پرخلوص اضطراب نے اپنے عہد کو کچھ اسی طرح متاثر کیا تھا۔ وہ مجسم انقلاب تھیں۔ تحرک، اضطراب اور تغیر ان کی عملی شخصیت کے نمایاں پہلو تھے۔ رشید جہاں کا بیانیہ اپنے آہنگ کے اعتبار سے بلند اور اپنی ترتیب کے اعتبار سے دبنگ ہے۔ وہ بلند آواز میں سوچتی ہیں۔ شاید اسی لیے ان کے بعض چاہنے والے بھی ان کو غصہ ور اور نفرت پر قابو نہ پا سکنے والی (۱۱) خیال کر جاتے ہیں۔ دراصل یہ جارحیت اس دباؤ کا نتیجہ تھی جو متوسط طبقے کے جدید تعلیم یافتہ طبقے پر رسم و رواج، مذہب اور مذہب کا کاروبار کرنے والے تنذخود ملاؤں نے بڑھا رکھا تھا۔ برصغیر میں مسلمانوں کی معاشرتی حالت قابل رحم تھی۔ معاشرتی تبدیلی کے لیے کاوش کرنا تو رشید جہاں کو ورثے میں ملا تھا۔ وہ معاشرے کو اور زندگی کو ہر پہلو سے بدلنا چاہتی تھیں۔ انھوں نے خواتین کے معاملات و مسائل کو بھی موضوع بنایا۔ ڈاکٹر سیما صغیر لکھتی ہیں کہ ''انھوں نے آزادی نسواں کے تئیں معاصر خواتین افسانہ نگاروں کی طرح مصالحانہ نہیں، جارحانہ رویہ اختیار کیا۔ پسند کی شادی کی اجازت، جہیز، مہر، طلاق اور وارثت کے حقوق کو موضوع بنایا۔ قدامت پرستی کے خلاف نڈر ہو کر صدائے احتجاج بلند کی .....مرد کی حاکمانہ برتری، تذلیل اور تضحیک آمیز رویہ کو بے نقاب کرتے ہوئے عورت کو باعزت طریقہ سے جینے کا حق دار بتایا اور ایک عورت کو قوت گویائی عطا کی۔ ان کے اسی احتجاجی رویے کی وجہ سے انھیں پہلی انقلابی افسانہ نگار خاتون کہا گیا ہے۔''(۱۲) لیکن رشید جہاں کی تاثیر اور اہمیت کو صرف ایک افسانہ نگار کے طور پر سمجھنا ایک تشنہ اور نامکمل عمل ہوگا۔

رشید جہاں کی خدمات کا دائرہ قدرے وسیع ہے۔ وہ عملی اشتراکی بھی تھیں۔ مزدوروں میں کام کیا۔ ٹریڈ

یونین کی سرگرمیوں کو منظّم کرنے کی سعی کی۔ تعلیم اور پیشے کے اعتبار سے میڈیکل ڈاکٹر تھیں لیکن ساری عمر غریبوں کے لیے کام کرنے کو ترجیح دی۔ محنت کشوں کی تنظیم سازی اور ان کی بہبود کے لیے کوشش کرنا ان کی عمومی مصروفیات میں سے ایک تھا۔ وہ نہایت مضطرب اور بے چین انقلابی تھیں۔ ریلوے مزدوروں کی ہڑتال کے نتیجے میں ۱۹۴۹ء میں تین ماہ کے لیے قید بھی کاٹی۔ (۱۳) لیکن یہ ساری قربانیاں ان کے عزم کو کمزور نہ کر سکیں۔ رشید جہاں نے اس زندگی کے وسیع ترین دامن میں سے صرف سینتالیس (۴۷) برس چرائے تھے، انہی سینتالیس برسوں میں انھوں نے متوسط طبقے کے پڑھے لکھے مسلمان نوجوانوں کو بالعموم اور خواتین کو بالخصوص یہ سبق یاد کرادیا کہ زندگی کے احوال کا تعین اور تجزیہ ان کا بنیادی منصب اور زندگی کی ترتیب و تزئین ان کا بنیادی حق ہے۔ آج دہشت گردی کی جنگ میں ملوث اکیسویں صدی کے پاکستان کے لیے رشید جہاں ایک نڈر افسانہ نگار ایک سماجی مصلح اور خواتین کی تعلیم و ترقی کے لیے جدوجہد کرنے والی سے زیادہ خود ساختہ تاویل مذہب کی بنا پر خواتین کی تعلیم و ترقی روکنے کی سعی کرنے والے مجرموں کے خلاف مزاحمت کی ایک بلیغ علامت کے طور پر سامنے آتی ہیں ہمیں اس رشید جہاں کے عزم کو از سرنو زندہ کرنا ہے جس کی وفات پر فیض نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس کے جانے سے ہمارے برصغیر سے نیکی اور انسان دوستی کی بہت بڑی دولت چھن گئی۔ (۱۴)

آج کا دہشت گرد اگر زیادہ منہ زور اور موذی ہے تو پھر لازم ہے کہ آج کے مزاحمت کار بھی رشید جہاں کی طرح زیادہ نڈر، زیادہ پرخلوص اور زیادہ پیشہ ور ہوں۔ ایک مہذب معاشرے کی تشکیل کے لیے ان تھک جدوجہد کرنے والی پرجوش اور پرخلوص رشید جہاں جنھیں بیسویں صدی کے نصف اول کی مذہبی دہشت گردی اپنے مقصد سے روکنے میں ناکام رہی وہ نامراد ملاؤں کے شور شرابے کو نظر انداز کر کے آگے بڑھتی رہیں اور آج اکیسویں صدی کے اوائل میں بھی رشید جہاں کا نصب العین، مقصد سے خلوص اور انتہا پسندی کے خلاف مزاحمت کرنے کی قوت ہمارے لیے ایک مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔

حوالے/حواشی

۱۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء کے دوران خاص طور پر روسی اور فرانسیسی ادب کے تراجم سامنے آئے تھے کہ اردو تراجم بھی مشاہیر ادیبوں مثلاً سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، مجنون گورکھ پوری اور اختر حسین رائے پوری کے تھے۔ انگارے ایک جائزہ، شبانہ محمود، ص ۲۶

۲۔ محمد اقبال، ''حرف اقبال''، ص ۶۵، ۶۶

۳۔ ہر کہ او را قوت تخلیق نیست.....پیش ما چیز کافر و زندیق نیست:: (اقبال: جاوید نامہ)

۴۔ انگارے ایک جائزہ، مرتب شبانہ محمود، ص ۱۶

۵۔ (1) عورت اور دیگر افسانے (2) شعلہ جوالہ (3) وہ اور دیگر افسانے وڈرامے

نو ڈرامے حسب ذیل ہیں:

(1) پردے کے پیچھے (2) عورت

(3) گوشہ عافیت (4) پڑوسی (5) ہندوستانی

(6) کانٹے والا (7) مرد عورت (8) بچوں کا خون

(9) نفرت

چھ مضامین

(1) پریم چند، ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کانفرنس (2) ہماری آزادی

(3) ادب اور عوام (4) اردو ادب میں انقلاب کی ضرورت

(5) عورت گھر سے باہر (6) چندر سنگھ گڑھوالی

''ترقی پسند ادب کے معمار''، قمر انیس، ص ۲۵۹، ۲۶۰

۶۔ انوار احمد، ڈاکٹر، ''اردو افسانہ، ایک صدی کا قصہ''، ص ۸۱

۷۔ ایوب مرزا، ڈاکٹر، ''فیض نامہ''، ص ۴۸

۸۔ سجاد ظہیر، ''روشنائی''، ص ۴۴، ۴۵

۹۔ ایضاً، ص ۵۲

۱۰۔ فیض احمد فیض، ''دست صبا''، مشمولہ: ''نسخہ ہائے وفا''، ص ۸

۱۱۔ انوار احمد، ڈاکٹر، ''اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ'' میں اس تاثر کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ ''عموماً اپنے تعصّبات کے ساتھ ساتھ غصے اور نفرت پر قابو نہیں پا سکتیں اور اپنی بیشتر کہانیوں میں پھٹ پڑتی ہیں۔'' ص ۸۹

۱۲۔ قمر انیس، پروفیسر (ترتیب و مقدمہ)، ''ترقی پسند ادب کے معمار''، ص ۲۶۰

۱۳۔ شبانہ محمود (مرتبہ)، ''ایک انگارے ایک جائزہ''، ص ۶۳

۱۴۔ فیض احمد فیض، ''صلیبیں مرے دریچے میں''، ص ۱۰۸